جب مجھے سزائے موت سُنائی گئی

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی
لمحہ بہ لمحہ داستان

انٹرویو۔ مولاناسیّد خلیل احمد قادری

ترتیب۔شفقت عثمانی۔خلیل احمد رانا

تعارف

امین الحسنات مولانا سیّد خلیل احمد قادری، مفسر قرآن حضرت مولانا ابوالحسنات سیّد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ ابن مولانا سیّد دیدار علی الوری محدّث لاہوری علیہ الرحمہ (خلیفہ مجاز امام احمد رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہٗ) کے اکلوتے فرزند ارجمند اور اپنے والد محترم کی رحلت کے بعد تادم حیات تاریخی

مسجد وزیر خاں (لاہور) کے خطیب رہے، مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف لاہور سے دستار فضیلت حاصل کی اور طب وحکمت میں اپنے والد ماجد کے مخصوص نسخوں اور طریق علاج کے امین رہے، آپ نے جوانی کے دور میں دینی تحریکوں میں حصہ لیا، ''تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء'' میں ایک مجاہد کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے، گرفتار ہوئے، لاہور کے قلعہ کے عقوبت خانہ میں رہے، مارشل لاء نے انہیں سزائے موت کا حکم سنایا مگر ثابت قدم رہے، تحریک ختم نبوت میں ایک طویل عرصہ تک پسِ دیوار زنداں رہے، لاہور میں مسجد وزیر خاں کے پاس'' جامعہ حسنات العلوم'' قائم کیا، مسجد کی خطابت کو تادم زیست اپنایا، اپنے والد مکرم کی تفسیر قرآن ''تفسیر الحسنات'' کے آخری حصوں کو مکمل کیا اور انہیں چھپوایا، مولانا امین الحسنات سیّد محمد خلیل احمد قادری اشرفی خطیب جامع مسجد وزیر خاں لاہور وامیر جامعہ حسنات العلوم کا ایک کتابچہ'' عید الضحیٰ مع احکام ومسائل قربانی'' مطبوعہ لاہور، سن طباعت درج نہیں، صفحات ۴۴، راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے، مجاہد تحریک ختم نبوت مولانا سیّد خلیل احمد قادری اشرفی نے ۲۷/ ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ/ ۲۷/ مارچ ۱۹۹۸ء بروز جمعہ لاہور میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مجاہد تحریک ختم نبوت امین الحسنات مولانا سیّد خلیل احمد قادری علیہ الرحمہ بیان کرتے ہیں:

۱۹۵۱ء کے اواخر ہی میں مرزائیوں کے اخبار ''الفضل'' (ربوہ) نے محمود بشیر کی نہایت اشتعال انگیز تقریروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، سر ظفر اللہ کے وزیر ہونے کے باعث مرزائی اپنے آپ کو بہت زیادہ طاقتور تصور کرنے لگے تھے اور وہ غالباً اس زعم میں بھی مبتلا ہو چکے تھے کہ پاکستان میں ان کے ناپاک عزائم کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی مؤثر قوت موجود نہیں ہے، چنانچہ ''الفضل'' نے سرخیاں جمائیں'' جب تک اپنے دشمنوں کو قدموں پر نہ جھکا لو چین سے نہ بیٹھو'' ، ''ہمارے پاس عسکری قوت موجود ہے'' ، ''۱۹۵۳ء گزرنے نہ پائے گا کہ ہم اپنے مخالفین کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ہمارے قدموں پر آ کر گریں'' وغیرہ وغیرہ۔

ان اشتعال انگیز تحریروں سے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہوا اور ان کے سینوں میں ایک لاوا سا پکنے لگا جو ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا، مختلف شہروں سے علماء کرام اور دیگر حضرات وفود کی صورت میں میرے والد محترم مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری کے پاس آئے اور انہوں نے مرزائیوں کے خلاف تحریک چلانے کا

مطالبہ کیا، علماء اہل سنت کے علاوہ دیگر مکاتیب فکر کے اکابر علماء مثلاً سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نے قبلہ والد صاحب کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ وہ مرزائیوں کے خلاف تحریک کی قیادت کریں، یہ سب حضرات اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ والد محترم قبلہ سیّد صاحب کے تحریک پاکستان میں مجاہدانہ کردار اور دیگر قومی و ملی خدمات کے باعث ان کا سواد اعظم میں بہت زیادہ اثر و رسوخ ہے، چنانچہ تمام کاتیب فکر کے زعماء نے ان سے تحریک ختم نبوت کی قیادت قبول کر لینے پر اصرار کیا، اور پھر برکت علی محمڈن ہال میں ایک عظیم الشان کنونشن کا اہتمام کیا گیا جس میں تمام کاتیب فکر کے اکابر علماء شریک ہوئے، اس موقع پر جلسہ کی صدارت صاحبزادہ غلام محی الدین سجادہ نشین آستانہ عالیہ گولڑہ شریف نے فرمائی جو مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت کے پیش نظر پہلی بار عوامی اجتماع میں تشریف لائے تھے، تونسہ شریف اور علی پور شریف کے سجادہ نشین حضرات کے علاوہ ملک بھر سے جیّد مشائخ اس کنونشن میں شریک ہوئے، اس کنونشن میں یہ طے پایا تھا کہ تمام مکاتیب فکر کے نمائندوں پر مشتمل ایک مجلس عمل تشکیل دی جائے، چنانچہ اس موقع پر تمام جماعتوں نے ابوالحسنات علامہ سیّد محمد احمد قادری کو صدر منتخب کیا، سیّد داؤد غزنوی کو جنرل سیکرٹری کے فرائض سونپے گئے اور دیگر سرکردہ حضرات میں سیّد عطا اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین، شیخ حسام الدین اور صاحبزادہ فیض الحسن (مجلس احرار) شامل تھے، مجلس عمل میں جمعیت علماء پاکستان کے مولانا عبد الحامد بدایونی، مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین، جمعیت اہل حدیث کے مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عطاء اللہ حنیف، جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد، امین احسن اصلاحی اور نصر اللہ خاں عزیز، جمعیت علماء اسلام کے مولانا احمد علی لاہوری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے لال حسین اختر اور محمد علی جالندھری شامل تھے، مرکزی تنظیم کے قیام کے بعد صوبائی اور ضلعی کمیٹیاں بنا دی گئیں اور مختلف مقامات پر کنونشنوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان کنونشنوں میں جو تین مطالبات حکومت کے سامنے رکھے گئے ان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے، ظفر اللہ سمیت تمام قادیانیوں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹانے اور ربوے کو کھلا شہر قرار دینے پر زور دیا گیا تھا، پنجاب اور ملک کے دوسرے صوبوں میں جلسوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

۱۹۵۲ء میں مرکزی انجمن حزب الاحناف کا سالانہ اجلاس مسجد وزیر خاں میں شروع ہوا، نماز جمعہ کے بعد پہلی نشست سے حضرت علامہ ابوالحسنات نے خطاب کرنا تھا لیکن چند گھنٹے قبل اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب

ممتاز دولتانہ نے دفعہ ۱۴۴ کے تحت جلسوں وغیرہ پابندی عائد کروادی، حضرت علامہ ابوالحسنات نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تقریر کی اور انہوں نے دولتانہ کو چیلنج کیا کہ وہ ختم نبوت کی حق آواز کو نہیں روک سکتے، انہوں نے نہایت پُرجوش انداز میں فرمایا!

''اگرچہ دولتانہ تحریک پاکستان میں ہمارے ہم سفر رہے ہیں لیکن آج کلمہ حق بلند کرنے کے جرم میں وہ ہمیں بخوشی گرفتار کر سکتے ہیں ہم پاکستان کی بقاء اور استحکام کے لئے تحریک ختم نبوت کو جاری رکھیں گے''۔

دفعہ ۱۴۴ کی کھلی خلاف ورزی کے باوجود انہیں گرفتار نہ کیا گیا اور سہ روزہ اجلاس بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا، اس کے بعد تحریک چلتی رہی اور اجتماعی جلسوں کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۵۳ء کے اوائل میں مجلس عمل نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد کی صورت میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان سے ملا جائے اور انہیں اپنے مطالبات اور ملکی صورت حال سے آگاہ کیا جائے، چنانچہ علامہ ابوالحسنات کی قیادت میں ایک وفد ترتیب دیا گیا جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی، عطاءاللہ شاہ بخاری، سید داؤد غزنوی، صاحبزادہ فیض الحسن، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، سید مظفر علی شمسی اور مولانا محسن فقیہ شافعی شامل تھے، یہ وفد کراچی پہنچا اور وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کر کے قوم کے مطالبات ان کے سامنے رکھے گئے، خواجہ صاحب نے مطالبات کو سننے کے بعد کہا:

''میرے لئے ان مطالبات کو مان لینا بہت مشکل ہے کیونکہ اگر میں سر ظفر اللہ کو کیبنٹ سے نکال دوں تو امریکہ ناراض ہو جائے گا اور جو امداد پاکستان کو مل رہی ہے وہ بند ہو جائے گی''

قائد وفد علامہ ابوالحسنات نے جواباً فرمایا:

''ہم تو سمجھے تھے کہ آپ کا ناصر اور رازق اللہ تعالیٰ ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ سب کچھ امریکہ کو سمجھتے ہیں ...... حکومت کو ہمارے مطالبات بہر حال منظور کرنا ہوں گے ورنہ ہمیں موجودہ تحریک کو ڈائریکٹ ایکشن کی طرف لے جانا پڑے گا، ہاں البتہ ہم آپ کو سوچنے کے لئے وقت دینے کو تیار ہیں، اس وقت تک ہم تحریک کو نرم رکھ سکتے ہیں''

لیکن خواجہ ناظم الدین پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے واضح طور پر مطالبات کو منظور کرنے سے انکار کر دیا، اس کے بعد کراچی ہی میں مجلس عمل کا ایک اجلاس بلایا گیا جس میں متذکرہ وفد کے ارکان کے علاوہ مولانا مودودی اور مولانا احتشام الحق تھانوی بھی شامل تھے، اس اجلاس کی کئی نشستیں ہوئیں اور آخری نشست میں ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا گیا، ۲۶؍فروری ۱۹۵۳ء کی شام کو نشتر پارک کراچی میں جلسۂ عام کا اعلان کیا گیا، مولانا مودودی ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط کرنے کے بعد لاہور واپس آگئے اور ۲۶؍فروری کی شام کو پروگرام کے مطابق نشتر پارک میں عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں مولانا مودودی اور مولانا احتشام الحق تھانوی کے علاوہ باقی تمام اکابرین نے تقاریر کیں، ۲۶؍اور ۲۷؍فروری کی درمیانی شب کو جلسہ سے فارغ ہونے کے بعد یہ حضرات جب واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا، ۲۷؍فروری کو جمعہ کے روز اکابرین کی گرفتاریوں کی خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ مشتعل ہو کر سڑکوں پر نکل آئے، لاہور میں دلی دروازہ کے باہر ایک بہت بڑا اجتماع ہوا اور مشتعل ہجوم نے مرزائیوں کے اداروں اور ان کے مکانوں کو آگ لگانے کا پروگرام بنایا، نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد میں مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین کے ہمراہ اجتماع میں پہنچا اور ہم نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اعلیٰ سطح کی میٹنگ کے فیصلے کا انتظار کریں، ۲۷؍اور ۲۸؍فروری کی درمیانی شب مولانا غلام محمد ترنم اور حافظ خادم حسین کو بھی گرفتار کر لیا گیا، اگلے روز ۲۸؍فروری کو صبح نو بجے کے قریب میں مولانا مودودی سے ملاقات کر کے صورت حال کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے ان کی اقامت گاہ پر پہنچا، مولانا عبدالستار خان نیازی بھی اس موقع پر موجود تھے، مولانا مودودی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے تحریک میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا، انہوں نے فرمایا!

''مولانا احتشام الحق تھانوی کا رات ٹیلی فون آیا تھا ڈائریکٹ ایکشن کی تجویز سے انہیں اور مجھے اتفاق نہیں تھا اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم تحریک میں حصہ نہ لیں'' میں نے عرض کی آپ کے تو دستخط موجود ہیں پھر یہ فیصلہ کیسا؟ مولانا نے جواباً فرمایا! وہ میٹنگ کا فیصلہ تھا، اب صورت حال مختلف ہے، بہرحال میں تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا، مولانا عبدالستار خان نیازی نے اس موقع ان سے کہا لوگ اس وقت بہت مشتعل ہیں اور وہ جذبات میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں کوئی ان کی قیادت کرنے والا نہیں، آپ مجلس عمل کے رکن ہیں، اگر اب

آپ آگے نہیں آنا چاہتے تو ہمیں اختیار دیجئے تا کہ ہم تحریک چلا سکیں ، مولانا مودودی ہمیں تحریری طور پر اختیارات دینے پر رضا مند ہو گئے ،مولانا داؤ د غزنوی دل کے عارضہ میں مبتلا تھے،انہوں نے بھی ہمیں اختیارات لکھ کر دے دیئے ،اس کے بعد میں مولانا احمد علی لاہوری کے پاس گیا،انہوں نے کہا،میرا بستر ابندھا ہوا رکھا ہے، مولانا ابوالحسنات میرے صدر ہیں، میں نے ان کو تار دے دیا ہے اوران کا جواب ملنے پر میں ان کے حکم کی تعمیل کروں گا،،اس کے جواب میں میں نے کہا،مولانا ابوالحسنات تو اس وقت جیل میں ہیں، نہ آپ کا تار انہیں پہنچے گا اور نہ ان کا جواب آپ کو ملے گا،لہٰذا اگر ٹالنا مقصود ہے پھر تو الگ بات ہے اوراگر آپ کا ارادہ عملاً حصہ لینے کا ہے تو آپ وعدہ فرمایئے ،انہوں نے کہا میں تیار ہوں جو حکم مجھے دیا جائے گا میں اس کی تعمیل کروں گا،اس کے بعد میں مفتی محمد حسن (نیلا گنبد) کے پاس گیا تو انہوں نے اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا میں ٹانگوں سے معذور ہوں اس لئے عملاً حصہ نہیں لے سکتا، میں نے اُن سے کہا! جناب آپ معذورضرور ہیں لیکن قیامت کے دن میرے آقا گنبد خضریٰ کے مکیں حوض کوثر پرجلوہ افروز ہوں گے اورآپ سے فرمائیں گے کہ میرے نام پر کھاتے رہے،عزت کرواتے رہےاور مفتی کہلواتے رہے لیکن جب میری ناموس کا مسئلہ آیا تو معذوری ظاہر کر دی، اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ یہ سن کا مفتی صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا، انہوں نے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر چوما اور پھر کہنے لگے، آپ مجھے جب چاہیں گرفتار کروادیں، اگرآپ ابھی چاہیں تو میں اسی وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں،اس گفتگو کے بعد میں وہاں سے دلی دروازہ کی طرف روانہ ہوا۔

یہاں میں نے دیکھا کہ تقریباً ایک لاکھ افراد کا جم غفیر موجود تھا اور لوگ منتظر تھے کہ کوئی انہیں پروگرام بتائے ، میں وہاں سے فوراً مولانا غلام دین صاحب خطیب انجن لوکوشیڈ کے پاس پہنچا،اس وقت ظہر کا وقت تھا اور مولانا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا! مولانا آپ کو آج ہی اور اسی وقت گرفتاری پیش کرنا ہے،مولانا نے بلا حیل وحجت فرمایا ’’نماز پڑھ لوں یا پہلے چلوں‘‘ میں نے عرض کی وہاں لوگ منتظر ہیں، نماز آپ وہیں پڑھیں اورتقریر کے بعد جلوس کی قیادت کرتے ہوئے چیئرنگ کراس پہنچ کر گرفتاری دیں،مولانا نے گھر پر اطلاع دے دی اور فوراً میرے ساتھ دہلی دروازہ کی طرف روانہ ہو لئے ، وہاں پہنچ کرانہوں نے نماز ظہر پڑھائی اور ایک نہایت ایمان افروز تقریر فرمائی، اس کے بعد انہوں نے ایک عظیم الشان جلوس کی قیادت کرتے

ہوئے چیئرنگ کراس پہنچ کر گرفتاری دے دی۔

اسی روز شام کو مسجد وزیر خاں میں رضا کاروں کا اجتماع شروع ہو گیا، میں بھی بستر لے کر مسجد وزیر خاں پہنچ گیا اس کے بعد پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا کہ صبح دس بجے مسجد وزیر خاں میں اجلاس ہوتا اور دس رضا کار جلوس کے ساتھ گرفتاریاں پیش کرتے اور نماز ظہر کے بعد دہلی دروازہ کے باغ سے (جو اس وقت اکبری دروازہ تک پھیلا ہوا تھا) دس رضا کار گرفتاریاں پیش کرتے، روزانہ گرفتاریاں پیش کرنے والوں کی قیادت کوئی ایک عالم دین کرتا تھا، مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا بہاء الحق قاسمی بھی میرے ساتھ مسجد وزیر خاں میں تھے، ۲۹ر فروری کو مولانا احمد علی لاہوری نے دہلی دروازے کے اجلاس میں تقریر کر کے گرفتاری پیش کی۔

ظفر علی خاں کے صاحبزادے اور ''زمیندار'' کے ایڈیٹر اختر علی (جو کہ مجلس عمل کے خازن بھی تھے) نے پہلے تو تحریک کی پُر زور حمایت کی لیکن جب دولتانہ وزارت کی طرف سے ان پر دباؤ ڈالا گیا تو ان کا رویہ بدل گیا، عوام نے ''زمیندار'' کی کاپیاں جلا کر احتجاج کیا، اور پھر ۳۰ر فروری کی شام کو مشتعل ہجوم نے ان کا گھیراؤ کر لیا، انہوں نے جان بچانے کے لئے برقعہ پہنا اور گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر مسجد وزیر خاں پہنچ گئے اور اگلے روز انہوں نے بھی تقریر کر کے گرفتاری پیش کر دی۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں رضا کاروں کا ایک جلوس دہلی دروازے سے حسب معمول نکلا اور جب یہ جلوس برانڈرتھ روڈ پہنچا تو پولیس نے بلا جواز سخت تشدد کیا جس کے باعث بہت سے رضا کار شدید زخمی ہو گئے، ہم نے مسجد وزیر خاں میں ڈسپنسری کا انتظام پہلے سے ہی کر رکھا تھا، چنانچہ ان کا علاج شروع ہو گیا، اسی دوران شہر میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ ڈی ایس پی فردوس شاہ نے قرآن پاک کی توہین کی ہے، چنانچہ اگلے روز ظہر کے اجلاس میں ایک صاحب نے مجمع عام میں قرآن پاک کے پھٹے ہوئے اوراق پیش کئے جس سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اور ان کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔

چوک وزیر خاں کے قریب پولیس کا ایک سپاہی کشمیری بازار کی طرف سے آ رہا تھا، لوگوں نے اسے گھیر لیا، اس نے جان بچانے کے لئے ایک قریبی مکان میں پناہ لی، جب وہ کھڑکی سے باہر سر نکالتا تو لوگ نعرے لگاتے، یہ خبر ڈی ایس پی فردوس شاہ تک پہنچی تو وہ اس سپاہی کو بچانے کے لئے ایک گارڈ کے ہمراہ چوک وزیر خاں کی

طرف چلا، اور پھر اس کا ایک مشتعل جلوس سے آمنا سامنا ہو گیا، کسی شخص نے زور سے کہا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے قرآن پاک کی توہین کی ہے، اتنا سننا تھا کہ پورا جلوس ان پر پل پڑا اور ان کو وہیں قتل کر دیا گیا، درحقیقت یہ ساری واردات حکومت نے ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت کروائی تھی، کیونکہ دولتانہ وزارت چاہتی تھی کہ اسے تشدد کا کوئی بہانہ ہاتھ آئے تاکہ تحریک کو کچلا جا سکے، چنانچہ اس واقع کے بعد وسیع پیمانے پر تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور رات بھر گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں، فردوس شاہ کے قتل کے بعد کرفیو لگا دیا گیا تھا، لیکن ہم نے مسجد وزیر خاں کا اجلاس جاری رکھنے اور بدستور گرفتاریاں پیش کرنے کا فیصلہ کیا، اسی روز مولانا غلام محمد ترنم، مولانا غلام دین، حافظ خادم حسین صاحب اور مولانا احمد علی لاہوری کو ہتھکڑیاں لگا کر لاہور سے ملتان لے جانے کے لئے اسٹیشن پر لایا گیا، جس سے عوام کا اشتعال اور زیادہ بڑھ گیا، رات کو مسجد وزیر خاں میں میری صدارت میں ایک اجلاس ہوا جس میں فردوس شاہ کے قتل اور حکومت کی اشتعال انگیز کاروائیوں کی مذمت کی گئی۔

تحریک کی نظامت اس وقت میرے پاس تھی، حکومت کے کچھ نمائندے میرے پاس آئے اور انہوں نے دورانِ گفتگو بتایا کہ دولتانہ حکومت نے آپ کے مطالبات منظور کر لئے ہیں اس لئے آپ تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیں، میں نے جواباً انہیں یہ بتایا کہ تحریک کی باگ ڈور اور اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار ان لوگوں کے پاس ہے جو کراچی اور سکھر جیل میں محصور ہیں لہذا آپ ان سے رابطہ قائم کیجئے، اگر انہوں نے ہمیں تحریک ختم کرنے کا حکم دے دیا تو ہم کوئی پس وپیش نہیں کریں گے، بصورت دیگر ہم پوری قوت کے ساتھ مطالبات منوانے کے لئے جدوجہد جاری رکھیں گے، اس کے بعد حکومت کے نمائندے مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

۳/ مارچ کو مسجد وزیر خاں میں مسلم لیگ کی کچھ خواتین آئیں، انہیں دراصل ایک سازش کے تحت بھیجا گیا تھا تاکہ کوئی ہنگامہ آرائی ہو اور تشدد کرنے کا بہانہ ہاتھ آ سکے، لیکن ہم نے عوام پر کنٹرول کرتے ہوئے ان خواتین کو مسجد سے محفوظ جگہ تک پہنچا دیا اور اس طرح حکومت کی سازش ناکام ہو کر رہ گئی، مسجد وزیر خاں میں ہر روز بعد نماز عشاء بھی جلسہ عام کا اہتمام ہوتا تھا جس میں بڑی ایمان افروز تقاریر ہوتیں، ۵/ مارچ تک تحریک نے پورے پنجاب میں زور پکڑ لیا تھا سندھ اور سرحد میں بھی ہنگاموں کا سلسلہ جاری تھا، ۴/ مارچ ۱۹۵۳ء کو سارا دن گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں، جس مکان سے ختم نبوت کی آواز بلند ہوتی اس کے مکینوں کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا

جاتا ۴؍ مارچ کی رات کو مسجد وزیر خاں کے اجلاس میں ہم نے ''پہیہ جام ہڑتال'' کا اعلان کر دیا، انتہائی مختصر نوٹس کے باوجود اس اپیل کے نتیجے میں اگلے روز ایسی شاندار ہڑتال ہوئی کہ اس کی مثال نہیں ملتی حتیٰ کہ اخبارات میں خبر پڑھنے کے بعد گورنمنٹ ہاؤس سیکرٹریٹ کے سرکاری ملازمین نے بھی قلم چھوڑ دیئے، کسی بس یا ٹرک کا تو ذکر ہی کیا تانگہ یا رکشہ تک نظر نہ آتے تھے، غرضیکہ اس ہڑتال نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

۵؍ مارچ کی شام کو پورے ملک میں ایک عجیب سناٹا تھا عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی میدان میں نکل آئے تھے، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، راولپنڈی اور سندھ کے بہت سے علاقوں میں تھانوں پر شمعِ ختمِ نبوت کے پروانوں نے قبضہ کر لیا تھا، دولتانہ کی صوبائی اور خواجہ ناظم الدین کی مرکزی حکومت بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھی، اسی روز پولیس نے دہلی دروازے کے اجلاس پر پابندی عائد کر دی اور لوگوں کو اس میں شرکت سے روکا، جب پولیس کو کامیابی نظر نہ آئی تو اس نے گولی چلا دی، اس موقع پر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں نے سینے تان تان کر گولیاں کھائیں اور جامِ شہادت نوش کیا، مسجد وزیر خاں زخمیوں اور شہداء سے بھر چکی تھی، زخمیوں کی مرہم پٹی اور شہداء کے کفن دفن کا انتظام بڑی سرگرمی سے جاری تھا، ایک عجیب منظر تھا، ہر طرف خون میں نہائے ہوئے نوجوان لیٹے تھے، اس موقع پر عوام کے تعاون کا یہ عالم تھا کہ خوراک اور مالی امداد کے علاوہ جس چیز کی بھی اپیل کی جاتی فوراً مہیا ہو جاتی، زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کے لئے کثیر تعداد میں ڈاکٹر اور ڈسپنسر پہنچ چکے تھے اور انہوں نے رضا کارانہ طور پر تمام خدمات انجام دیں، اس روز تقریباً چالیس مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا اور سینکڑوں کی تعداد میں زخمی ہوئے، شہداء کو تدفین کے لئے جلوس کی شکل میں قبرستان میانی صاحب اور دیگر قبرستانوں میں لے جایا گیا، دو شہداء کی قبریں سنہری مسجد کشمیری بازار کے عقب میں بنا دی گئیں، اس وقت ملت اسلامیہ کے جوش و جذبے کا یہ عالم تھا کہ انہیں مرنے مارنے کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا، ہماری طرف سے لوگوں کو پُر امن طور احتجاج کرنے کی اپیلیں مسلسل جاری کی جا رہی تھیں۔

دولتانہ وزارت نے اس موقع پر ایک اور چال چلی کہ ہوائی جہاز کے ذریعے اشتہارات پھینکے گئے کہ حکومت نے مطالبات منظور کر لئے ہیں اور تحریک ختم ہو گئی ہے لیکن یہ چال بھی کامیاب نہ ہو سکی اور عوام حکومت کے ہتھکنڈے کو فوراً سمجھ گئے۔

۶ / مارچ کو جنرل اعظم کی قیادت میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا، یہ مارشل لاء انتہائی سخت تھا اور ریڈیو سے دھمکی آمیز اعلانات نشر ہو رہے تھے، دن کے بارہ بجے ریڈیو پاکستان سے اعلان ہوا ''مولانا عبدالستار خاں نیازی اور مولانا خلیل احمد قادری اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں ورنہ انہیں دیکھتے ہی گولی ماردی جائے گی'' مولانا عبدالستار خان نیازی اس وقت صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے اور ہماری خواہش تھی کہ وہ اس مسئلہ پر اسمبلی میں تقریر کریں، اسمبلی کا اجلاس چند روز میں ہی شروع ہونے والا تھا، چنانچہ ہم نے مولانا عبدالستار نیازی خاں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں، مولانا نیازی نے اس تجویز سے اتفاق کیا، مولانا نیازی چند افراد کے ہمراہ مسجد کے مغربی اور جنوبی مینارہ سے متصل مکان میں منتقل ہوئے اور پھر دیہاتیوں کا سا لباس پہن کر لاہور سے باہر چلے گئے، اس موقع پر تحریک دشمن عناصر نے یہ افواہیں پھیلائیں کہ مولانا نیازی دیگ میں بیٹھ کر گئے ہیں اور یہ کہ انہوں نے داڑھی منڈوالی ہے، یہ افواہیں صرف تحریک کو ناکام بنانے کے لئے پھیلائی گئیں اور پولیس نے اپنی خفت مٹانے کے لئے انہیں ہوا دی حالانکہ ان باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

۶ / مارچ کو مسجد وزیر خاں میں تقریباً تین چار ہزار رضا کار موجود تھے، مسجد میں پروگرام کے مطابق اجلاس ہوتے رہے اور ۵، ۶ رضا کار گرفتاریاں پیش کرتے رہے، ۷ / مارچ کو نماز ظہر کے بعد مسجد میں اجلاس ہو رہا تھا اور رضا کار جلوس کی تیاری کر رہے تھے کہ مسجد سے متصل سڑک پر جنرل محمد ایوب خاں (جو بعد میں سربراہ مملکت بھی بنے) چند دیگر فوجی افسران کے ہمراہ آئے اور انہوں نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان کیا کہ مولانا خلیل احمد قادری اور مسجد کے اندر موجود تمام رضا کار خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں ورنہ ہم انہیں مسجد کے اندر داخل ہو کر گرفتار کر لیں گے اور اس طرح جو کشت وخون ہوگا اس کی ذمہ داری انہی افراد پر ہوگی، اس کے جواب میں مَیں نے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کی اور حضرت امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ پیش کیا کہ جب بادشاہِ وقت نے اپنی بیگم زبیدہ کو ان الفاظ میں مشروط طلاق دی کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میری سلطنت سے باہر چلی جاؤ ورنہ تم پر میری طلاق ہو جائے گی، غصے کے عالم میں تو بادشاہ نے یہ بات کہہ دی لیکن جب غصہ ختم ہوا تو وہ پریشان ہو گیا اور اس نے علماء سے فتویٰ پوچھا، علماء نے جواب دیا کہ حدود سلطنت سے نکلنا لازم ہے ورنہ طلاق ہو جائے گی، حضرت امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپ نے سارا واقعہ سننے کے بعد فرمایا

کہ بادشاہ سے کہو وہ بے فکر ہو جائے سورج غروب ہونے سے پہلے اس کی بیگم اس کی حدود سے نکل جائے گی اور یہ شرط پوری ہو جانے کے بعد طلاق نہیں ہوگی، سورج غروب ہونے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تو بادشاہ بہت گھبرایا اور اس نے اپنے نمائندے دوبارہ امام صاحب کی خدمت میں بھیجے، آپ نے فرمایا کہ بیگم کو مسجد میں لے آؤ اور علماء سے پوچھ لو کہ مسجد بادشاہ کی حدودِ مملکت سے باہر ہے یا نہیں؟ چنانچہ بیگم صاحبہ کو مسجد میں لایا گیا اور تمام علماء نے بالاتفاق یہ فیصلہ دے دیا کہ مسجد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی مملکت نہیں ہے، اور اس طرح طلاق نہیں ہوئی، اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد میں نے کہا کہ مسجد خانہ خدا ہے اور اگر مارشل لاء حکام نے مسجد میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو اس کا بڑی سختی سے جواب دیا جائے گا اور تمام تر ذمہ داری فوجیوں پر عائد ہوگی، میں نے یہ بھی کہا کہ فوج اور پولیس کو مسلمانوں پر گولیاں چلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، ایک مسلمان کا خون دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کے بعد خدا کے فضل وکرم سے فوجی افسران کسی کاروائی کے بغیر ہی واپس چلے گئے، اس موقع پر یہ بات بھی سننے میں آئی کہ ایک مرزائی فوجی افسر نے مسجد کو ڈائنامیٹ سے اُڑا دینے کا منصوبہ بنایا تھا، لیکن وہ ناکام رہا اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا، اس روز بھی حسب معمول جلسہ ہوا اور رضا کاروں نے گرفتاریاں پیش کیں۔

ریڈیو اور اخبارات پر حکومت کا مکمل کنٹرول تھا اور ہمارے خلاف مسلسل پروپیگنڈا کیا جارہا تھا، لیکن اس موقع پر مولانا سیّد محمود احمد رضوی (لاہور) اور ان کے رفقاء نے تحریک کی حمایت میں اشتہارات سائیکلو سٹائل کر کے شہر کے مختلف حصوں میں لگانے کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی، حکومت نے مسجد وزیر خاں میں کچھ ایسے افراد بھیج دیئے تھے جو رضا کاروں کے حوصلے پست کرنے کے لئے سرگرم عمل تھے۔

۸ر مارچ کو فجر کی نماز کے بعد جب کرفیو کھلا تو میں نے ایک مختصر سی تقریر کی اور اعلان کیا کہ ہم لوگ ناموس مصطفیٰ کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں لہذا جو شخص اپنے دل میں ذرا سی بھی کمزوری محسوس کرتا ہے اسے میری طرف سے اجازت ہے وہ جا سکتا ہے، وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری، میری تقریر کے بعد مسجد میں صرف ڈیڑھ ہزار جانثار رہ گئے اور باقی سب گھروں کو چلے گئے، اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مسجد وزیر خاں کی بجلی اور پانی بند کر دیا گیا تھا اور خوراک کے تمام راستے بھی مسدود تھے، لیکن ہمارے پاس مسجد کے حوض میں پانی کا کافی ذخیرہ موجود تھا، اس کے علاوہ گڑ اور چنے کی بوریاں ہم نے پہلے سے

ہی مسجد میں محفوظ کر لی تھیں، چنانچہ یہ خوراک استعمال کی گئی، امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ دوپہر کے وقت میرے پاس آئے اور انہوں نے گورنر پنجاب نواب چندریگر کا یہ پیغام مجھے دیا کہ وہ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، میں نے مسجد سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا اور وہ واپس چلے گئے۔

۸؍مارچ کی شام کو رنگ محل، شیرانوالہ گیٹ اور موچی دروازہ سے مسجد تک ریت کی بوریاں چن دی گئیں اور خاردار تار بچھا دیئے گئے تاکہ نہ تو کوئی مسجد کے اندر آسکے اور نہ کوئی واپس جا سکے، مسجد کے شمالی اور مغربی حصے کا مکانات خالی کروا کر ان پر سٹین گنیں اور دیگر ہتھیار نصب کر دیئے گئے، رات بھر مسجد میں ذکر الٰہی جاری رہا، نعرہ ہائے تکبیر و رسالت اور ختم نبوت زندہ باد کے فلک شگاف نعرے فضاء میں گونجتے رہے۔

۹؍مارچ کو صبح دس بجے امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ میرے پاس دوبارہ تشریف لائے، موصوف تحریک پاکستان راہنما اور قبلہ والد صاحب کے دوست تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ سارے شہر میں فوج کا کنٹرول ہو چکا ہے اور اگر آپ نے مزاحمت جاری رکھی تو جانوں کا بھی نقصان ہوگا اور مسجد کی بے حرمتی کا بھی خطرہ ہے، قدوائی صاحب سے گفتگو کے بعد میں نے رضا کاروں سے مشورہ کیا تو فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے میں اپنی گرفتاری پیش کر دوں، چنانچہ میں گرفتاری پیش کرنے کے لئے قدوائی صاحب کے ہمراہ مسجد کے جنوبی دروازے سے باہر آیا، ایک کرنل، دو کیپٹن اور کثیر تعداد میں فوجی باہر موجود تھے، انہوں نے پستول اور ریوالور ہماری طرف کر کے ہم کو گھیرے میں لے لیا، میں ہنس پڑا اور میں نے ان سے کہا! میں تو خود گرفتاری پیش کر رہا ہوں، اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے، کرنل نے جواب دیا آپ ہم کو مسلمان نہیں سمجھتے، آپ نے مسجد میں اسلحہ جمع کر رکھا ہے اور میناروں پر پوزیشن لی ہوئی ہے اس لئے یہ کچھ کرنا پڑا، میں نے اس کرنل کو کہا! اگر آپ مرزائی ہیں تو پھر یقیناً مسلمان نہیں اور اگر مسلمان ہیں تو پھر کسی مسلمان کو غیر مسلم سمجھنا بہت بڑا ظلم ہے، رہا مسجد میں پوزیشن سنبھالنے اور اسلحہ جمع کرنے کا سوال تو یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی، دروازے کھلے ہیں اور آپ اندر جا کر دیکھ سکتے ہیں، اس پر وہ ہنس پڑا اور اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا، قدوائی صاحب بھی میرے ہمراہ تھے، کپڑے جو میں نے پہن رکھے تھے کافی پھٹ چکے تھے، کیونکہ ۲۸؍فروری کو مسجد میں منتقل ہونے کے بعد مجھے گھر جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا، جب مجھے خرادی محلّہ کی طرف لایا گیا تو میں نے فوجیوں سے کہا کہ میرا مکان قریب ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں

کپڑے تبدیل کرلوں، کرنل نے رضامندی ظاہر کردی، لیکن جب ہم چند قدم آگے آئے تو کرفیو کے باوجود عورتیں، مرد اور بچے گھروں سے باہر نکل آئے اور انہوں نے نعرے لگانے شروع کردیئے، اس صورت حال کو دیکھ کر کرنل نے مجھے کہا اب آپ ہمارے ساتھ چلیں کپڑے ہم بعد میں آپ کو منگوادیں گے، چوہٹہ مفتی باقر سے ہمیں پُرانی کوتوالی لایا گیا، یہاں تک ہم پیدل ہی آئے، پرانی کوتوالی میں فوجیوں نے بڑے بڑے وائرلیس لگا رکھے تھے انہوں نے وائرلیس پر اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی کہ ملزم کو پکڑ لیا گیا ہے اور اسے ہم لے کر آرہے ہیں، پھر ہمیں پرانی کوتوالی سے دہلی دروازے تک پیدل ہی لایا گیا، ہمیں زیر حراست دیکھ کر لوگ مکانوں کی چھتوں سے نعرے لگانے لگے، دہلی دروازے سے جیپ میں بٹھا کر شاہی قلعہ کی طرف لے جایا گیا، مارشل لاء حکام کو ہماری گرفتاری کی اطلاع تو ہو ہی چکی تھی، شاہی قلعہ میں داخل ہوئے تو عام خاص دربار کے بالائی حصے میں تین چار لمبے لمبے قد والے فوجی افسران کو بیٹھے ہوئے دیکھا، پھر وہ نیچے آئے میز اور کرسیاں بچھائی گئیں اور وہ فوجی افسران کرسیوں پر بیٹھ گئے (غالباً ایک فوجی افسر کا نام سرفراز تھا)، مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا گیا، قدوائی صاحب میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے، ایک فوجی افسر نے سب سے پہلا سوال مجھ پر کیا کہ کیا آپ غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور یہ تحریک کسی ملک کے ایما پر چلائی جارہی ہے؟ میں جواباً کہا ۱۹۴۷ء میں تحریک پاکستان کی حمایت میں خضر وزارت کے خلاف جو ایجی ٹیشن ہوا تھا کیا وہ بھی غیر ملکی سازش تھی؟ جن لوگوں نے اس تحریک میں گرفتاریاں پیش کیں کیا وہ بھی غیر ملکی ایجنٹ تھے؟ ہماری تحریک تو ان لوگوں کے خلاف ہے جو غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور مذہبی اور سیاسی لحاظ سے پاکستان کے دشمن ہیں، ان لوگوں نے بانی پاکستان قائداعظم کی نماز جنازہ تک پڑھنے سے گریز کیا، آج یہ لوگ ملک کے کلیدی عہدوں پر فائز ہوگئے ہیں، ہم نے یہ تحریک ان کو کلیدی عہدوں سے علیحدہ کرنے کے لئے چلائی ہے۔

پھر اس فوجی افسر نے دوسرا سوال کیا کہ کیا آپ قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے؟ میں نے جواب دیا ''نہیں''، اس نے پوچھا کیوں؟ میں نے جواب دیا سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور قادیانیوں نے ایک بناسپتی نبی پیدا کرلیا ہے اور ان کا فقہ بھی مسلمانوں سے علیحدہ ہے، ضابطہ اخلاق بھی جدا ہے اور سیاسی نظام بھی مختلف ہے، اس نے پوچھا فقہ کیسے علیحدہ ہے؟ میں نے جواباً کہا زانی کو ہم مسلمان

حکم قرآنی کے مطابق کوڑوں کی سزا کا حق دار سمجھتے ہیں اور قادیانیوں نے زنا کی سزا دس جوتے مقرر کی ہے جو زانیہ زانی کو لگاتی ہے، اس طرح قادیانیوں نے زنا کا بھی دروازہ کھول دیا ہے، یہ جواب سن کر تو وہ آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے انگریزی میں گالیاں دینی شروع کر دیں۔

قدوائی صاحب نے اسے ٹوکا تو دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی، فوجی افسر نے قدوائی صاحب کو کہا، اب تم بھی اپنے آپ کو گرفتار سمجھو میں تمہارے ساتھ نپٹ لوں گا، قدوائی صاحب نے اس سے پوچھا، کیا آپ قادیانی ہیں؟ اس جواب دیا پورا ملک قادیانیوں کا ہے، اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا، تقریباً ایک بج چکا تھا اور ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی، پھر کرسیاں اُٹھالی گئیں اور ہم نیچے فرش پر بیٹھ گئے، چاروں طرف پٹھان فوجی ہماری نگرانی کر رہے تھے، اسی دوران ظہر کا وقت ہو گیا اور ہم نے وضو کے لئے پانی مانگا، ہمیں شمالی حصے میں لایا گیا جہاں نلکا لگا ہوا تھا، وہاں سے وضو کرنے کے بعد میں نے اذان دی، اذان کی آواز سن کر کچھ فوجی اور کچھ رضا کار جو پہلے ہی گرفتار ہو کر آئے ہوئے تھے، نماز پڑھنے کے لئے آ گئے، چنانچہ میں نے امامت کروائی اور سب نے باجماعت نماز ادا کی، نماز کے بعد میں نے خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کی، دعا کے بعد فوجی میرے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے مجھ سے گرفتاری کی وجوہات پوچھیں، میں نے قادیانیوں کا پول کھولا اور تحریک کا پسِ منظر بیان کیا، میری باتیں سن کر فوجیوں نے اپنی چادریں بچھا دیں اور نہایت محبت کے ساتھ پیش آئے، ایک فوجی میس میں گیا اور ہمارے لئے کھانا لے آیا، پھر ہم نے نماز عصر بھی اسی طرح باجماعت ادا کی، نماز عصر کے بعد پہلے فوجیوں کی ڈیوٹیاں تبدیل کر دی گئیں اور نئے فوجی آ گئے، انہوں نے پھر ہمیں نیچے بٹھا دیا اور نہایت سختی کا مظاہرہ کیا، ہلنے تک کی ممانعت تھی، نماز مغرب کا وقت ہوا تو میں نے پھر اسی طرح اذان دی اور باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد دعا میں مشغول ہو گیا، یہ نئے فوجی بھی دعا سے بڑے متاثر ہوئے انہوں نے بھی ہم سے سوالات کئے، ہم نے تفصیلات بتائیں تو ان کا رویہ فوراً بدل گیا اور وہ بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آئے، نماز مغرب کے بعد مجھے اور قدوائی صاحب کو جیپ میں بٹھا کر مغربی حصے میں واقع سی آئی اے کے دفتر میں لایا گیا، جہاں ہمارا نہایت فحش اور غلیظ گالیوں سے استقبال ہوا، قدوائی صاحب کو مجھ سے علیحدہ کر دیا گیا اور مجھے اوپر کے حصے میں لے جا کر ایک چھوٹی سی حوالات میں بند کر دیا گیا جس میں پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا، رات کو مجھے کھانا بھی نہیں دیا گیا اور میں

بھوکا ہی سو گیا۔

حوالات کے قریب کوئی سپاہی نہیں تھا جس سے پانی مانگا جا سکے، چنانچہ اگلے روز فجر میں نے تیمّم کر کے ادا کی، نماز کے بعد میں نے قدوائی صاحب کی آواز سنی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ نچلے حصے کی حوالات میں ہیں، تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص ایک کپ چائے اور ایک چھوٹی سی روٹی رکھ کر چلا گیا، میں نے اسے غنیمت جان کر ناشتہ کیا، دس گیارہ بجے کے قریب سی آئی اے کا ایک افسر آیا اور مجھے حوالات سے نکال کر اپنے دفتر میں لے آیا، چھوٹے قد کے اس افسر کا نام غالباً چوہدری اصغر تھا، اس نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی، میں نے لاعلمی کا اظہار کیا، درحقیقت مجھے اس وقت مولانا کے متعلق کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں، جب میں کچھ نہ بتا سکا تو اس نے مغلظات سنانا شروع کر دیں، کچھ دیر تو میں خاموشی سے سنتا رہا لیکن پھر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اس سے کہا وہ میرے بزرگوں کے متعلق ایسے الفاظ استعمال نہ کرے ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا، یہ بات سننے کے بعد وہ بکتا ہوا چلا گیا اور مجھے ایک دوسری حوالات میں تنہا بند کر دیا گیا، شام کے وقت سی آئی اے کا ایک اور افسر آیا اور اس نے دفتر میں لے جا کر قدرے نرمی سے تحریک کے متعلق سوالات پوچھے جس کے میں نے مناسب جوابات دیئے، پوچھ گچھ کا یہ سلسلہ تقریباً ۱۵/ مارچ تک جاری رہا، اس دوران مجھے قید تنہائی میں ہی رکھا گیا، دوپہر اور شام کو دال روٹی دی جاتی، ایک روز مجھے جب حوالات میں بند کرنے کے لئے لے جایا گیا تو متصل حوالات میں مفتی محمد حسین نعیمی نظر آئے، ہم دور سے ہی ایک دوسرے کو سلام کر سکے اس سے زیادہ کی اجازت نہ تھی، مجھے بعد میں علم ہوا کہ گرفتاری کے اگلے روز ہمارے مکان پر چھاپہ مارا گیا، اس زمانے میں جمعیت علمائے پاکستان کا مرکزی دفتر ہمارے گھر میں ہی تھا، مرزائیوں کے خلاف سارا لٹریچر، جمعیت کی فائلیں، لاؤڈ اسپیکر، سائیکلوسٹائل مشین اور کئی دوسری چیزیں پولیس نے قبضہ میں لے لیں، اس وقت مکان پر مستورات کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، مستورات کو پردے میں کرا دیا گیا، اور دفتری سامان کے ساتھ ساتھ گھریلو سامان کی بھی تلاشی لی گئی۔

۱۵/ مارچ سے ۲۵/ مارچ تک معمول یہ رہا کہ دن کے وقت مجھے قید تنہائی میں رکھا جاتا اور رات کو تقریباً دس گیارہ بجے تیز روشنی میں بٹھا کر نہایت بدتمیزی سے سوالات کئے جاتے، اس کے بعد مجھے پریشان کرنے کے لئے ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا، حوالات کی پچھلی طرف ایک کھائی تھی اس میں فائر کئے جاتے اور پھر ایک افسر

سپاہیوں سے پوچھتا آج کتنے اُتارے؟ سپاہی جواب میں چار یا چھ کہتا اور پھر مجھے کہا جاتا اب آپ کی باری بھی آنے والی ہے، پھر پوچھ گچھ کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک تہہ خانے میں لے جایا جاتا اور وہاں اوٹ پٹانگ سوالات کر کے پریشان کرنے کی کوشش کی جاتی، اسی دوران ایک بڑا عجیب واقعہ پیش آیا، ایک روز مجھے تہہ خانے میں اُتارا جا رہا تھا، جب تین چار سیڑھیاں باقی رہ گئیں تو میں نے دیکھا کہ تقریباً ڈیڑھ گز لمبا سانپ پھن پھیلائے فرش پر پڑا ہے، میرے ساتھ آنے والے افسر نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے معافی نہ مانگی تو مجھے اس سانپ کے اُوپر ڈال دیا جائے گا، میں نے اپنے حوصلے کو قائم رکھا اور معافی مانگنے سے صاف انکار کر دیا، اس نے مجھے دھکا دینے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ مظبوطی سے تھام لیا، چنانچہ اتفاق یہ ہوا کہ وہ اپنے ہی زور سے نیچے کی طرف لڑھک گیا اور پھر بدحواسی کے عالم میں اوپر کی طرف بھاگا، میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی، جب مجھے حوالات میں بند کرنے کے لئے پولیس کی بارک کے سامنے سے گزارا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے، میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے اور پھر ہتھکڑی کو چوم کر آنکھوں سے لگالیا، میرے ساتھ چلنے والے سپاہیوں نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے انہیں کہا خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ ہتھکڑیاں کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں نہیں پہنیں اور مجھے فخر ہے کہ میں نے آج اللہ کے پیارے حبیب شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس اور عظمت کے تحفظ کی خاطر یہ زیور پہنا ہے، یہ سن کر وہ سپاہی خاصے متاثر ہوئے اور انہوں نے کہا دل تو ہمارے آپ کے ساتھ ہیں لیکن ہم کر کچھ نہیں سکتے، ملازمت کا معاملہ ہے، میں نے ان سے کہا یزیدی فوج بھی یہی کہتی تھی اگر تم مجھے حق پر سمجھتے ہو تو اسوۂ حر رضی اللہ عنہ پر عمل کرو، یہ سن کر وہ شرمندہ ہو گئے۔

۳۰؍ مارچ کو حوالات میں سو رہا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ مغرب کی جانب سے ایک کوّا اڑتا ہوا آ رہا ہے اور اس کے منہ میں ایک چھوٹا سا سانپ ہے، یہ کوا اُڑتا ہوا دوسری سمت چلا گیا، جب میں بیدار ہوا تو اس خواب کا اثر ذہن پر موجود تھا، میں اس خواب کی تعبیر سوچنے لگا، چند لمحے بعد ماشکی گھڑے میں پانی ڈالنے کے لئے آیا تو اس نے بتایا کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت ختم ہو گئی ہے، یکم اپریل کو ایک افسر نے آ کر مجھ سے کہا کہ آپ کے والد نے معافی مانگ لی ہے اور وہ گھر واپس آ گئے ہیں، لہٰذا آپ بھی معافی مانگ لیں، میں اس کی چال فوراً

سمجھ گیا اور میں نے کہا میں ایک بہادر اور غیور باپ کا بیٹا ہوں، آپ غلط بیانی کر رہے ہیں میرا والد ہرگز معافی نہیں مانگ سکتا، میرا جواب سن کر وہ ناکام واپس چلا گیا۔

۲/اپریل سے اذیت کا سلسلہ اور بڑھا دیا گیا، رات دن مجھے قلعے کے مختلف حصوں میں تبدیل کر دیا جاتا، رات کو جگایا جاتا اور تیز روشنی میں بٹھا کر ایک افسر سوال کرتا، ابھی میں اس کا جواب دینے نہ پاتا تھا کہ دوسرا سوال کر دیا جاتا، حوالات کے دروازے پر رائفل بردار فوجی ہر وقت موجود رہتے تھے، اگر میں ان سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ گردن ہلا کر معذرت کا اظہار کر دیتے تھے، ماشکی گھڑے میں پانی لا کر ڈالتا اور خاموشی سے واپس چلا جاتا، گویا وہ ماحول صمٌ بکمٌ فھم لا یرجعون کا سا تھا، لیکن حوصلہ اور ہمت اس لئے بلند تھی کہ تاجدارِ ختم نبوت کی ناموس کا معاملہ تھا، ایک روز میرے اصرار پر ایک پہرے دار فوجی نے بتایا کہ انہیں سختی سے آرڈر ہے کہ میری نقل وحرکت کی نگرانی کی جائے اور میرے ساتھ کوئی بات نہ کی جائے، اس نے بتایا کہ اگر کسی افسر نے اسے میرے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تو اس کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔

۷/اپریل کی شب مجھے قلعے کے اندر ایک بڑی حوالات میں لے جایا گیا، یہاں مختلف علاقوں کے رضا کار موجود تھے، یہاں پہنچ کر یہ انکشاف ہوا کہ مسجد وزیر خاں میں جوشیلے نعرے لگانے اور سائے کی طرح ہر وقت ہمارے ساتھ رہنے والے رضا کار دراصل سی آئی ڈی کے ملازم تھے، سی آئی ڈی کے کچھ ملازم اس حوالات میں بھی ہماری جاسوسی کے لئے موجود تھے، رضا کاروں کے اس اجتماع میں کئی شناسا چہرے بھی تھے، لاہور کے علاوہ راولپنڈی اور کراچی کے وہ کارکن بھی موجود تھے جنہوں نے تحریک میں سرگرم حصہ لیا تھا، یونس پہلوان اور ان کے ساتھیوں سے بھی یہیں ملاقات ہوئی، ایک مدت کے بعد کارکنوں سے گفتگو کرنے کا موقع نصیب ہوا تھا، چنانچہ ہم سب رات تین بجے تک تحریک کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کرتے رہے، سی آئی ڈی کے ملازم پوری توجہ سے ہماری گفتگو سنتے رہے، لیکن اب چونکہ ان کے چہرے بے نقاب ہو چکے تھے اس لئے ہم نے بڑے محتاط انداز میں باتیں کیں، پھر اچانک ایک پولیس انسپکٹر آیا اور اس نے میرا نام پکارا، پھر اس نے یونس پہلوان اور بلال گنج کے کارکن غلام نبی کا نام بھی پکارا اور کہنے لگا کہ مزنگ میں ایک قتل ہوا ہے اور اس میں آپ تینوں کا نام بھی آ رہا ہے ،لہذا آپ ہمارے ساتھ چلیں اور اپنی صفائی پیش کریں، ہمیں یہ بات سن کر بہت حیرانی ہوئی اور ہم نے اسے جواباً

کہا کہ ہم نو مارچ سے قلعے میں بند ہیں اور باہر کرفیو لگا ہے، قتل کرنے کے لئے ہم کیسے چلے گئے، ہم نے پولیس افسر پر واضح کر دیا کہ ہم رات کے وقت کہیں جانے کو تیار نہیں ہیں اور اگر اس نے کوئی انکواری کرنی ہے تو صبح آئے، ہمارا جواب سن کر اس نے کہا کہ وہ اپنے افسران بالا کو بتا دے گا اور اگر انہوں نے اسی وقت بلایا تو پھر ہمیں بلا حیل وحجت چلنا ہوگا، یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔

۸/اپریل کو عصر کے بعد ڈی ایس پی، سی آئی اے نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور کاغذ اور قلم میرے سامنے رکھ دیا اور مجھے کہا کہ میں جو کچھ بھی چاہتا ہوں کاغذ پر لکھ دوں، میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی، تو اس نے جواب میں مغلظات سنانا شروع کر دیں، میں یہ گالیاں برداشت نہ کر سکا اور میں نے اسے کہا آپ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں لیکن میرے بزرگوں کو گالی نہ دیں ورنہ آپ کو اس بڑی سخت سزا ملے گی کیوں کہ میرے بزرگوں کا تعلق اہل بیت سے ہے، یہ باتیں سن کر وہ مرعوب سا ہو گیا، اس کے بعد فائرنگ کی آواز آئی اور پھر دو سپاہی دفتر میں داخل ہوئے، ڈی ایس پی نے ان سے پوچھا آج کتنے اُتارے؟ انہوں نے جواب دیا ''دو''، سپاہی واپس چلے گئے اور پھر فائرنگ کی آواز آنے لگی، ڈی ایس پی نے فون اُٹھایا اور پھر وہی سوال دہرایا اب کتنے اُتارے؟ اور پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اب مزید چار افراد کو گولی ماردی گئی ہے، حکومت کے باغیوں کا یہی حشر ہوتا ہے، اور پھر اس نے بڑی لجاجت سے کہا آپ تو شریف آدمی ہیں اس کاغذ پر معافی نامہ لکھ دیجئے ہم آپ کو ابھی رہا کروادیں گے، میں نے اسے جواب دیا کہ جو حکومت ختم نبوت کی منکر ہو اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی باغی ہو میں اس سے ہرگز معافی نہیں مانگ سکتا، میرا جواب سن کر اس نے کہا میں اپنے یہی الفاظ کاغذ پر لکھ دوں، چنانچہ میں نے یہ الفاظ کاغذ پر لکھ دیئے، ڈی ایس پی نے یہ عبارت پڑھی تو غصے سے پاگل ہو گیا، اس نے قلم زور سے زمین پر مارا اور کاغذ پھاڑ دیا پھر مجھے مارنے کے لئے کرسی سے اُچھلا، میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور جلدی میں کرسی کا تکیہ ہی پکڑ سکا، لیکن اس پر اللہ کے فضل سے ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ مجھے کچھ کہے بغیر دفتر سے باہر چلا گیا، پھر ایک سپاہی آیا اور اس نے مجھے قلعے کے دروازے کے پاس حوالات میں لے جا کر بند کر دیا، اس روز دوپہر کو مجھے نہ تو کھانا دیا گیا اور نہ ہی پانی مل سکا، ظہر اور عصر کی نماز میں نے تیمّم سے ادا کی، مغرب کے وقت مجھے وضو کے لئے پانی دے دیا گیا اور پھر مجھے کھانا بھی دیا گیا جس میں خلاف معمول پھل بھی

تھے، تقریباً نو بجے مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک بڑے کمرے میں لایا گیا، یہاں میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور پھر مجھے سیدھا کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا، تھوڑی دیر کے بعد ایک سپاہی نے میرے بازو پکڑ کر اوپر کر دیئے اور ٹانگیں چوڑی کرنے کو کہا، اسی عالم میں دو تین گھنٹے گزر گئے پھر وہ سپاہی چلا گیا اور اس کی جگہ دوسرا آ گیا، اسی طرح تین تین گھنٹے کے بعد ڈیوٹیاں بدلتی رہیں، جونہی میں ہاتھ ذرا نیچے کرتا ڈیوٹی پر موجود سپاہی فوراً میرا بازو پکڑ کر ہاتھ اوپر کر دیتا، یہ اذیت ناک سلسلہ ساری رات جاری رہا، فجر سے دو گھنٹے قبل میرے پیٹ اور سینے میں شدید درد اُٹھا اور میں کراہنے لگا، لیکن ان لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، پھر میں نے تہجد کے نفل ادا کرنے کی اجازت مانگی، لیکن اس سے بھی انکار کر دیا گیا، درد سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں نے دُرود شریف کا ورد شروع کر دیا، چند ہی لمحے بعد کافی افاقہ ہو گیا، نماز فجر ادا کرنے کی اجازت بھی مجھے نہ مل سکی، رات کے نو بجے سے صبح گیارہ بجے تک یہی عالم رہا، طبیعت نہایت مضمحل تھی اور تھکاوٹ سے بدن چور چور ہو رہا تھا، میں نے سیدی سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے استغاثہ کیا اور یہ اشعار پڑھنے شروع کئے:

غوثِ اعظم بمن بے سرو ساماں مددے
قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور مجھے ہتھکڑی لگا کر حوالات میں لے گیا، یہاں ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ مجھے سونے نہ دے، پانی کا گھڑا تو لا کر رکھ دیا گیا مگر کھانا نہ ملا، نماز ظہر کے بعد میں نے داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس کی طرف رخ کیا اور اس شعر کا ورد شروع کر دیا:

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

عصر کے بعد وہ سپاہی چلا گیا اور میری آنکھ لگ گئی، خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں سبز رنگ کی روشنی ہے، اس کمرے کی سیڑھیاں ہیں جس پر والد محترم حضرت علامہ ابوالحسنات (جو اس وقت سکھر جیل میں تھے) کھڑے ہیں، مجھے دیکھ انہوں نے سینے سے لگا لیا، میں نے ان سے پوچھا آپ کا کیا حال

ہے؟ توانہوں نے جواباً! فرمایا مجھے بھی انہوں نے رات بھر کھڑا رکھا ہے، اس گفتگو کے بعد میں اُن سیڑھیوں سے نیچے کمرے میں اترا تو میں نے دیکھا کہ شمالی جانب ایک دروازہ ہے جو کہ کھلا ہوا ہے، میں اس کمرے میں دوزانو بیٹھ گیا اتنے میں ایک بزرگ سپید نورانی چہرہ، کشادہ پیشانی، درمیانہ قد، سفید داڑھی، کھلی آستینوں کا سبز کرتہ زیب تن کئے میری طرف تشریف لائے اور پیچھے سے ایک آواز آئی ''سرکار غوث اعظم رضی اللہ عنہ تشریف لا رہے ہیں'' میں نے دست بستہ حضرت سے عرض کی، حضور ان کتوں نے بہت تنگ کر رکھا ہے، سرکار غوث اعظم نے میری داہنی طرف پشت پر تھپکی دی اور فرمایا شاباش بیٹا گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا، میں نے دوبارہ عرض کی حضور! انہوں نے بہت پریشان کر رکھا ہے، رُخ انور پر مسلسل شگفتگی تھی فرمایا کچھ نہیں، سب ٹھیک ہے اور یہ کہہ کر آپ واپس تشریف لے گئے، اس واقعہ کے بعد میرا حوصلہ بہت بلند ہو گیا ورنہ اس رات کی اذیت سے ممکن تھا کہ میں ڈگمگا جاتا، لیکن سرکار غوث پاک کے روحانی کرم نے مجھے ذہنی اور قلبی سکون سے مالا مال کر دیا، مغرب کے بعد مجھے کھانا دیا گیا اور پھر رات کو کسی نے مجھے پریشان نہیں کیا، دوسرے روز اعلیٰ فوجی افسر راؤنڈ کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ میں نے انہیں تمام واقعات بتائے، اور انہوں نے میرے سامنے متعلقہ پولیس افسران کی سرزنش کی اور کچھ ہدایات جاری کیں، پھر مجھے ایک دوسری حوالات میں منتقل کر دیا گیا جو قدرے بہتر تھی، وہاں میں نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کی آواز سنی مولانا تلاوت کلام پاک فرما رہے تھے، اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی قریبی حوالات میں ہیں، دوپہر کے وقت مجھے ایک بارک میں منتقل کر دیا گیا جہاں سے بالکل سامنے مولانا عبدالستار خاں نیازی تھے، مولانا نیازی نے اشارے سے سلام کیا اور خیریت پوچھی، فاصلہ چونکہ خاصا تھا اس لئے مزید کوئی بات نہ ہو سکی، پھر سی آئی اے کے ایک افسر اعجاز حسین (جو کہ میرے واقف کار تھے اور چوک نواب صاحب میں رہتے تھے) میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے ایک چادر اور کچھ کپڑے دیئے، انہوں نے بتایا کہ یہ کپڑے میرے تایا حافظ غلام احمد نے بھیجے ہیں، اس سے پہلے میرے کپڑے بہت زیادہ پھٹ چکے تھے اور بنیان میں جوئیں پڑ گئی تھیں، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے تایا حافظ صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ کپڑے بھی وہ اپنی ذمہ داری پر لے آئے ہیں ورنہ اس کی بھی اجازت نہیں ہے، مغرب کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا کہ معاً دل میں خیال آیا کہ یہاں خشک روٹی

اور چنے کی دال کے سوا کچھ نہیں مل رہا اگر اپنے گھر میں ہوتے تو حسب منشا کھانا کھاتے ،لیکن دوسرے ہی لمحے ضمیر نے ملامت کی اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی قربانیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا، میں نے سر بسجود ہو کر توبہ کی اور اس وسوسے کا ازالہ چاہا،لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ چند لمحے بعد اندھیرے میں ایک ہاتھ آگے بڑھا اور آواز آئی شاہ جی! یہ لے لو، اور پھر ایک لفافہ مجھے دیا گیا جس میں کچھ پھل اور مٹھائی تھی، میں حیران رہ گیا کہ اتنے سخت پہروں کے باوجود یہ سب کچھ مجھ تک کیسے پہنچ گیا،لیکن میرے دل کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ غیبی دعوت قاسم عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ملی ہے، وہ پھل اور مٹھائی تین روز تک میں استعمال کرتا رہا۔

دس اپریل کو تقریباً گیارہ بجے مجھے چارج شیٹ دی گئی، میرے خلاف ۲۹ مختلف دفعات کے تحت مقدمات قائم کئے گئے تھے، ان میں قتل وغارت اور فوج میں بدامنی پیدا کرنے کے مقدمات بھی شامل تھے، دوپہر ایک بجے کے قریب مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک بند گاڑی میں بٹھایا گیا اور بوسٹل جیل کے قریب ایک فوجی عدالت میں پیش کیا گیا،فوجی عدالت میں کیپٹن شفیق نے پولیس افسر سے پوچھا کہ ہتھکڑی کیوں لگائی گئی ہے؟ پولیس افسر نے کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کی،لیکن اس نے حکم دیا کہ ہتھکڑی کھول دی جائے، چنانچہ عدالت ہی میں میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور پھر مختصر سی عدالتی کاروائی کے بعد مجھے سنٹرل جیل (شادمان کالونی) پہنچا دیا گیا۔

سنٹرل جیل میں پہنچا تو وہاں ایک میلے کا سا سماں تھا، بارکوں کے باہر ہزاروں افراد کا اجتماع تھا، بارکوں میں جگہ ختم ہو جانے کے باعث خاردار تار لگا کر شمع رسالت کے پروانوں کو حراست میں رکھا گیا تھا،جیل کے مختلف حصوں میں عجیب کیف وسرور کی محفلیں برپا تھیں، کہیں نعت خوانی ہو رہی ہے تو کہیں ختم نبوت کے موضوع پر تقاریر،کہیں درود وسلام پڑھا جارہا ہے تو کہیں ذکر واذکار کا غلغلہ ہے،غرض ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔

مجھے سی کلاس کی ایک بیرک میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ رکھا گیا، دوسرے روز میں نے دیکھا کہ جیل کے گیٹ سے قطار کی صورت میں کچھ لوگ آرہے ہیں، جنہوں نے کندھوں پر بستر اُٹھا رکھے تھے، میں آگے بڑھا تو دیکھا کہ ان میں میاں طفیل محمد، مولانا کوثر نیازی، مولانا امین احسن اصلاحی، نصر اللہ خاں عزیز، نقی علی اور جماعت اسلامی کے بہت سے کارکن ہیں، ان حضرات سے علیک سلیک ہوئی اور میں نے پوچھا حضرت! آپ کیسے تشریف لائے ، جماعت اسلامی کے ایک سرکردہ رہنما نے جواب دیا، ہم تو گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے،ہمیں پکڑ

کر لے آئے ہیں، میں نے کہا آپ کا جرم کیا ہے (یعنی کس جرم میں آپ کو پکڑ کر لائے ہیں؟) وہ بولے جرم کا خود ہمیں بھی علم نہیں ......، ان حضرات کو بھی مختلف بارکوں میں جگہ دی گئی۔

جیل کے اندر ہی کچھ فوجی عدالتیں قائم کی گئی تھیں اور جو لوگ یہ تحریر لکھ دیتے تھے کہ ان کا تحریک کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، ان کی رہائی فوراً عمل میں آجاتی تھی، باوجودیکہ کافی لوگ اس طرح رہا ہونے میں کامیاب ہوگئے لیکن جیل کی رونق اور ہماہمی میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا، تیسرے روز مولانا عبدالستار خاں نیازی کو بھی قلعے سے سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا، مولانا مودودی کو بھی گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا، ان دونوں حضرات کو اے کلاس دے دی گئی اور ملاقات پر پابندی عائد کر دی گئی، میرے ساتھ سی کلاس میں اندرون دہلی دروازہ چنگڑ گلی کے نتھا پہلوان اور یکی دروازہ کے چند نامی گرامی غنڈوں کو رکھا گیا تھا، ایک روز مجھے جیل میں علم ہوا کہ میرے چچا زاد بھائی علامہ سیّد محمود احمد رضوی (جو کہ بعد میں مجلس عمل تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء کے مرکزی جنرل سیکرٹری بنے) کو بھی گرفتار کر کے جیل میں لایا گیا ہے، میں نے مہر محمد حیات ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سے مطالبہ کیا کہ انہیں میرے ساتھ رکھا جائے، انہوں نے فوراً یہ مطالبہ تسلیم کر لیا، محمود رضوی صاحب مجھے دیکھتے ہی بغلگیر ہو گئے اور میں نے ان کی خیریت دریافت کی، معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں کے مرض مبتلا ہیں، انہوں نے مجھے بتایا کہ سائیکلو سٹائل کے ذریعے جو ہدایات پورے شہر میں پہنچائی جاتی تھیں وہ ان کے قلم سے ہی لکھی جاتی تھیں اور ان کی گرفتاری اسی بنا پر عمل میں آئی ہے، محمود صاحب سے تحریک کی صورت حال اور گھر کی خیریت کا علم ہوا، ہمیں بم کیس کی بارکوں میں رکھا گیا تھا، ہماری قریبی بارکوں میں مولانا غلام محمد ترنم صدر جمعیۃ علمائے پاکستان (مغربی پاکستان) بھی تھے، اور ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی، انہی بارکوں میں ایک نو سالہ بچہ خالد بھی تھا جس کے خلاف بغاوت، ڈاکہ اور آتش زنی وغیرہ سنگین نوعیت کے مقدمات بنائے گئے تھے، آٹھ روز بعد فوجی عدالت نے اسے رہا کر دیا۔

مجھے ابھی تک اپنے والد محترم کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں، اور نہ ہی میرے متعلق انہیں کوئی علم تھا، البتہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ کراچی جیل میں انہیں میرے قتل کی اطلاع دی گئی تھی، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور سید مظفر علی شمسی کا بیان ہے کہ چند روز تک تو ہم نے یہ خبر علامہ ابوالحسنات سے چھپائے رکھی اور پھر آخر کار ایک روز ہم نے انہیں بتا ہی دیا کہ آپ کے صاحبزادے کو موت کی نیند سلا دیا

گیا ہے،، علامہ ابوالحسنات یہ سنتے ہی سجدے میں گر گئے اور انہوں نے فرمایا میرے آقا گنبد خضراء کے مکیں صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے اکلوتے بیٹے خلیل کی قربانی قبول ہے تو میں بارگاہِ ربی میں سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں، ناموس رسالت پر ایک خلیل تو کیا میرے ہزاروں فرزند بھی ہوں تو اسوۂ شبیری پر عمل کرتے ہوئے سب کو قربان کردوں، اس کے بعد انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر کا آغاز کر دیا، بعد میں والد صاحب کو سکھر جیل منتقل کر دیا گیا تھا، اور خود ان کا بیان ہے کہ جیل میں جب بھی مجھے تمہاری یاد آئی تو میں قرآن پاک کی تفسیر شروع کر دیا کرتا تھا اور اس سے دل کو تسکین ہو جاتی تھی، چنانچہ جیل میں انہوں نے نصف قرآن کی تفسیر مکمل کی اور باقی رہائی کے بعد تحریر فرمائی۔

چارج شیٹ میں فردوس شاہ ڈی ایس پی کے قتل کا الزام مجھ پر اور مولانا عبدالستار خاں نیازی پر عائد کیا گیا تھا، اور اس کی تفصیل یہ بتائی گئی تھی کہ مسجد وزیر خاں میں مولانا عبدالستار خاں نیازی جلسۂ عام سے خطاب کر رہے تھے اور صدارت میں کر رہا تھا، فردوس شاہ ڈی ایس پی پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا ہی تھا کہ مولانا نیازی نے کہا ان کتّوں کو مسجد سے نکالو، میں نے صدارت کی کرسی سے کہا جانے نہ پائیں، یہیں ختم کردو، یہ سن کر نتھا پہلوان اور تقریباً نو دیگر افراد فردوس شاہ پر پل پڑے اور اسے وہیں قتل کر دیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسجد میں نہ تو کوئی جلسہ ہو رہا تھا اور نہ تقریر، بلکہ ایک جلوس چوہٹہ بستی بھگت سے نکلا، فردوس شاہ ایک سپاہی کے تحفظ کے لئے آ رہا تھا کہ قتل کر دیا گیا۔

میرے خلاف مقدمہ قتل ایک فوجی عدالت میں چلایا گیا جو کہ سنٹرل جیل اور بوسٹل جیل کے درمیان لگائی گئی تھی، یہ مقدمہ تقریباً ۱۹ روز تک فوجی عدالت میں زیر سماعت رہا، حکومت کی طرف سے جو گواہ پیش ہوئے تھے وہ جرح کے دوران پسینے سے شرابور ہو جاتے اور ان کا جسم تھر تھر کانپنے لگتا، مولانا عبدالستار خاں نیازی اور میری طرف سے چودھری نذیر احمد (سابق اٹارنی جنرل) میاں غیاث الدین، رفیق احمد باجوہ، چوہدری کلیم الدین اور چند دیگر وکلاء فوجی عدالت میں پیش ہوئے، چوہدری نذیر احمد جب گواہوں پر جرح کرتے تو گواہوں کی حالت دیدنی ہوتی تھی، ایک گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ فردوس شاہ کی لاش مسجد وزیر خاں کے دروازے پر پڑی تھی اور میں اس کو اُٹھا کر چوک وزیر خاں میں لے آیا اور پھر میں نے پولیس کو اطلاع دے دی، اس نے ایک شیشی میں جائے وقوعہ سے لی گئی خون آلود مٹی بھی عدالت میں پیش کی، فوجی عدالت نے جو کہ ایک بریگیڈیر اور دو کرنلوں پر

مشتمل تھی، مجھ سے مسجد وزیر خاں میں جمعہ کا وقت پوچھا جو میں نے بتا دیا اور پھر عدالت نے کہا کہ وہ خود اگلے روز دس بجے صبح جائے وقوعہ کا معائنہ کرے گی۔

چنانچہ اگلے روز مولانا عبدالستار خاں نیازی اور میں، فوجی عدالت اور چند دیگر افراد کے ہمراہ مسجد وزیر خاں میں آئے، ہمیں دیکھ کر مکانوں کی چھتوں اور مکانوں سے محبان تاجدار ختم نبوت نعرے لگانے لگے اور فوجی عدالت نے اپنی آنکھوں سے ملت اسلامیہ کے جذبات کا مشاہدہ کیا، جب عدالت جائے وقوعہ پر پہنچی تو وہاں پر گواہ کے بیان کے بالکل برعکس مٹی کے بجائے سنگ سرخ کی سیڑھیاں تھیں، ۱۹ روز کی عدالتی کاروائی کے بعد عدالت نے ہمیں مقدمہ قتل سے بری کر دیا۔

بری ہونے کے بعد ہم جیل سے سامان لینے کے لئے گئے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے اور مولانا نیازی کو کہا کہ آپ جلدی سے گھر ہو آئیں کیوں کہ دوبارہ گرفتاری کا خدشہ ہے، چنانچہ ہم سامان لئے بغیر ہی جیل سے چلے آئے، گھر پہنچ کر میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کئے اور پھر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس پر پہنچ کر حاضری دی، واپسی پر دربار شریف کے باہر لوگوں نے گھیر لیا اور پھولوں کے ہار پہنائے، یہاں کئی دوستوں سے بھی ملاقات ہوگئی، ماشل لاء کی پابندیاں اگرچہ کافی نرم ہو چکی تھیں لیکن مارشل لاء کے اثرات ابھی بہت زیادہ باقی تھے، چوراہوں پر فوجیوں نے ریت کی بوریوں سے مورچے بنائے ہوئے تھے، میں دربار شریف سے گھر جانے کے لئے تانگے پر بیٹھا، ابھی تانگہ لوہاری گیٹ تک ہی پہنچا تھا کہ پیچھے سے ایک فوجی جیپ آئی اس نے ہارن دیا اور رکنے کا اشارہ کیا، ایک فوجی افسر نے میرے قریب آ کر وارنٹ دکھائے اور کہا تشریف لے آیئے آپ کو دوبارہ گرفتار کیا جا رہا ہے، مجھے چند گھنٹے تھانہ ٹیکی گیٹ میں رکھنے کے بعد شاہی قلعے میں پہنچا دیا گیا، اسی روز لوہاری دروازے کے کچھ افراد گرفتار ہو کر آئے تھے اور ان کے پاس گھر کا کھانا بھی موجود تھا، چنانچہ ان کے ساتھ میں نے بھی کھانا کھایا، ایک رات قلعے میں گزارنے کے بعد اگلے روز مجھے سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا، مولانا محمود احمد رضوی صاحب کو جیل سے ہسپتال کے ٹی بی وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا اور ملاقات پر پابندی لگا دی گئی تھی، پھر تقریباً ایک ماہ تک فوجی عدالت میں ۷/ مارچ کو مسجد وزیر خاں میں ہونے والی میری تقریر کے خلاف مقدمہ زیر سماعت رہا، اس مقدمہ میں بھی میری پیروی ان وکلاء صاحبان نے ہی کی جو کہ مقدمہ قتل میں پیش ہوئے تھے،

اگر چہ سرکاری گواہیاں جرح کے دوران ساقط ہو چکی تھیں لیکن مجھے سات سال قید با مشقت کی سزا سنائی دی گئی اور مجھے جیل میں قیدیوں کا لباس پہنا دیا گیا، پہلے بان اور چرخے کی مشقت دی گئی، اسی دوران مولانا عبدالستار خاں نیازی (جنہیں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا تھا) اور مولانا مودودی کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا، مولانا عبدالستار خاں نیازی کو جس وقت سزائے موت سنائی گئی میں فوجی عدالت میں موجود تھا، انہوں نے سزائے موت کا فیصلہ سننے کے بعد گرج کر کہا! بس... اس سے بھی زیادہ کوئی سزا آپ کے پاس ہے تو دے دیجئے، میں ناموس مصطفیٰ کی خاطر سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں، مولانا نیازی نے اس موقع پر کچھ اشعار بھی پڑھے، ان کا چہرہ تمتما رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سزائے موت کا فیصلہ سن کر انہیں ذرّہ بھر افسوس بھی نہیں ہوا۔

مجھے سات سال قید با مشقت کی سزا ہوئے تقریباً ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ فوجی عدالت نے مقدمہ بغاوت کی سماعت شروع کردی اور سرسری کاروائی کے بعد مجھے سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا، فوجی عدالت کے سربراہ نے فیصلہ پڑھا ''ملزم کو گلے سے اس وقت تک پھانسی پر لٹکایا جائے جب تک کہ وہ مر نہ جائے''، سزائے موت کا فیصلہ سننے کے بعد ایک لمحے کے لئے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا لیکن معاً بعد آیت کریمہ **بل احیاء ولکن لا تشعرون** زبان پر آ گئی اور پھر حوصلے کا یہ عالم تھا کہ جام شہادت نوش کرنے کے لئے طبیعت مچلنے لگی اور جنت کے لہلہاتے ہوئے باغات آنکھوں میں گھومنے لگے، مجھے سزائے موت کے قیدیوں کے لئے مخصوص ''پکی کوٹھی'' میں لاکر بند کر دیا، میں اپنے بخت رسا پر ناز کرنے لگا کہ مقام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کی خاطر جان کی قربانی پیش کرنے کی سعادت حاصل ہونے والی ہے۔

تین روز کے بعد مجھے دوبارہ فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے میری سزائے موت چودہ سال قید میں تبدیل کردی حالانکہ میں نے سزا میں تخفیف کے لئے کوئی اپیل نہ کی تھی، بعد میں مجھے علم ہوا میرے علاوہ مولانا نیازی اور مودودی صاحب کی سزائے موت کے فیصلے کے خلاف افغانستان کے ممتاز روحانی پیشوا ملا شور بازار (کابل)، حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی مدظلہ (مدینہ منورہ) کی طرف سے اور دیگر اسلامی ممالک کے گوشے گوشے سے حکومت پاکستان کو تاریں اور قرار دادیں موصول ہونا شروع ہوگئی تھیں جن میں ہماری فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا، اندرون ملک بھی بڑا موثر ردعمل ہوا، دوسری طرف مرزائیوں کے سرخیل محمود بشیر کے

لڑکے ناصر محمود کو رہا کر دیا گیا، سر ظفر اللہ اس وقت وزیر خارجہ تھا اور تحریک کا ایک اہم مقصد مرزائیوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹانا بھی تھا، ظفر اللہ نے ذاتی طور پر دلچسپی لے کر ناصر محمود کو رہا کروایا اور پاکستان کے طول وعرض میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی، سردار عبدالرب نشتر نے ہماری سزائے موت کو ختم کرانے کے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں، خان عبدالقیوم خان اس وقت وزیر داخلہ تھے، انہوں نے تحریک کو کچلنے کے لئے انتہائی تشدد آمیز رویہ اختیار کیا۔

میری سات سال اور چودہ سال کی سزائیں ایک ساتھ ہی شروع ہوگئی تھیں، میں بدستور سی کلاس میں تھا جہاں گڑ اور چنے کا ناشتہ کرنا پڑتا تھا، دال روٹی کھانے کو ملتی تھی، دال نہایت عجیب اور بدمزہ ہوتی تھی اور مسلسل کھانے سے دل اکتا چکا تھا پھر ایک قیدی قمرالدین نے مجھے سالن دینا شروع کر دیا اور یوں گزارہ ہونے لگا، ایک روز میں نے سکھر جیل کے پتے پر والد محترم کو اپنی خیریت کا خط لکھا جس کا جواب مجھے پندرہ روز کے بعد موصول ہوگیا، والد صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ تم رتبۂ شہادت حاصل نہیں کر سکے، لیکن بہرحال یہ جان کر دل کو اطمینان ہوا کہ تم ناموس مصطفیٰ کی خاطر لڑ رہے ہو، خط کے آخر میں لکھا:

''کاش اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کی قربانی قبول کر لیتا'' ۔

چند روز بعد مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا مودودی کی سزائے موت بھی چودہ سال قید بامشقت میں تبدیل ہوگئی اور انہیں اے کلاس کی بارکوں میں تبدیل کر دیا گیا، مجھے بدستور سی کلاس میں ہی رکھا گیا تھا، میں اکثر دوپہر کے وقت مشقت سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نیازی اور مولانا مودودی سے ملاقات کے لئے ان کی بارک میں چلا جایا کرتا تھا، یہ دونوں حضرات زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرتے تھے، دوپہر کے وقت مولانا نصر اللہ خاں عزیز لطائف کی محفل جماتے، ایک روز دوپہر کے وقت میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی، اُلٹیاں اور چکر آنے لگے، میں مولانا مودودی کی بارک میں داخل ہوا تو مولانا نے حسب معمول میری خیریت دریافت کی اور میری طبیعت ناساز پا کر انہوں نے اپنا کام چھوڑ دیا اور فوراً میری تیمارداری میں لگ گئے، انہوں نے جیل کے ڈاکٹر کو بلانے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر موجود نہ تھا، پھر انہوں نے اپنی دواؤں میں سے مجھے دوا دی جس سے میری طبیعت قدرے سنبھل گئی، اس طرح ان کے اخلاق نے مجھے بہت متاثر کیا۔

نصر اللہ خاں عزیز، سید نقی علی اور مودودی صاحب کے دیگر رفقاء جیل میں اکثر مودودی صاحب کی

تصنیفات تقسیم کیا کرتے تھے،ایک روز انہوں نے مجھے مولانا کا ایک کتابچہ ''تجدید احیائے دین'' پڑھنے کے لئے دیا،میں نے اسے بغور پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس میں اولیاء کرام کی تنقیص کی گئی ہے اور بزرگانِ دین سے عقیدت کو ہندوازم سے تعبیر کیا گیا ہے،اس کے علاوہ اس میں اور بھی کئی قابل اعتراض عبارات نظر سے گزریں، پھر ایک روز مجھے مودودی صاحب سے تخلیہ میں گفتگو کا موقع ملا تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس کتابچہ میں اولیاء کرام کے وجود سے انکار کیا ہے اور ان سے عقیدت کو ہندوازم سے تعبیر کیا ہے،آپ یہ الفاظ لکھنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں؟انہوں نے جواب دیا''مجھے تو آج تک کوئی ولی نظر نہیں آیا''میں نے عرض کی اگر آپ کو کوئی ولی نظر نہیں آیا تو اس بات کی دلیل نہیں کہ دنیا میں کوئی ولی موجود ہی نہیں،اور پھر آپ نے تو کسی نبی یا رسول کو بھی نہیں دیکھا،اللہ تعالیٰ بھی تو کبھی آپ کو نظر نہیں آیا،چنانچہ اگر آپ کا وضع کردہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو پھر خدا اور رسول کے وجود سے بھی انکار کرنا پڑے گا،یہ باتیں سن کر مودودی صاحب نے کہا یہ کتابچہ میں نے اس زمانے میں تحریر کیا تھا جب میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور انسان سے غلطی بھی تو ہوسکتی ہے،میں نے کہا آپ کی اس غلطی سے جو لوگ گمراہ ہوئے ہوں گے ان کا ذمہ دار کون ہے؟مولانا نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کرلی اور میں نے انہیں کہا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کرام کی شان میں واضح طور پر فرمایا ہے **الا ان اولیاء اللہ لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون** اور اس کے علاوہ بھی قرآن پاک میں اولیاء کرام کے متعلق بہت سی آیات موجود ہیں،لہٰذا آپ کے اس کتابچہ کی اصلاح ہونی چاہئے،مودودی صاحب کچھ جواب دینا چاہتے تھے لیکن اسی اثناء میں ان کے کچھ رفقاء آگئے اور بات دوسری طرف چل نکلی،اس کے بعد بھی ان سے کئی بار نہایت خوشگوار ماحول میں گفتگو کا موقع ملتا رہا۔

ایک روز جیل میں یہ اطلاع ملی کہ کچھ قیدیوں نے جیلر کی توہین کی ہے اور اس جرم کی پاداش میں انہیں ٹکٹکی لگائی جائے گی،ہم اپنی بارک سے اس مقام کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جہاں پانچ چھ افراد کو نہایت بے دردی سے بید لگائے گئے،ہم نے چھپ کر یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا،ملزموں کے جسم سے گوشت قیمے کی طرح کٹ کر فضا میں اُڑتا ہوا نظر آیا،اس دردناک واقعہ کی مکمل تفصیل ہم نے لکھ کر ممبران اسمبلی کو ارسال کی اور صوبائی اسمبلی میں حکومت کی طرف سے باقاعدہ یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ آئندہ جیل میں کسی ملزم کے ساتھ ایسا

وحشیانہ سلوک نہیں کیا جائے گا۔

اسی دوران مولانا احمد علی لاہوری کو ملتان سے سنٹرل جیل لاہور میں منتقل کر دیا گیا، وہ کچھ علیل تھے اس لئے انہیں جیل کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور پھر دو روز بعد معلوم ہوا کہ انہیں رہا کر دیا گیا ہے، ان کی رہائی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی، چنانچہ اس سلسلہ میں جیل میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ وہ معافی مانگ کر رہا ہوئے ہیں۔

۱۹۵۴ء میں حکومت نے ایک انکوائری کمیشن قائم کیا، اس کمیشن کے قیام سے دو روز قبل مجھے جیل میں بی کلاس دے دی گئی اور اب میرا قیام جیل کے اس حصے میں تھا جہاں مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا مودودی اور نصراللہ خاں عزیز وغیرہ تھے، انکوائری کمیشن کے قیام کے بعد سکھر جیل میں نظر بند تمام راہنماؤں کو سنٹرل جیل لاہور میں منتقل کر دیا اور ان تمام حضرات کو سنٹرل جیل کے اس حصے میں رکھا گیا جسے دیوانی گھر کہا جاتا ہے، جب میں پہلی بار ان حضرات سے ملاقات کے لئے دیوانی گھر کے دروازے پر پہنچا تو سب سے پہلے سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہوئی، انہوں نے مجھے ''شہید اعظم'' کہہ کر پکارا اور بغل گیر ہوگئے، چند قدم آگے بڑھا تو شیخ حسام الدین اور تاج الدین انصاری سے ملاقات ہوئی، میں نے اپنے والد محترم کے متعلق دریافت کیا تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بڑ کے درخت کی طرف لے گئے جہاں میرے والد محترم ایک چارپائی پر بیٹھے قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے، پہلی نظر میں تو میں انہیں پہچان بھی نہ سکا کیونکہ وہ بہت کمزور ہوگئے تھے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آرہے تھے، والد محترم نے مجھے دیکھا تو اُٹھ کر سینے سے لگا لیا میں نے عرض کی آپ اتنے کمزور کیوں ہوگئے؟ والد محترم نے فرمایا سکھر جیل سقر جیل تھی، ۱۲۵ ڈگری گرمی تھی اور جس بارک میں ہمیں رکھا تھا اس کے اوپر لوہے کی چادریں تھیں، پانی بھی وقت کی پابندی کے ساتھ ملتا تھا، اکثر پسینے سے ہی غسل کر کے تفسیر کا کام شروع کر دیتا تھا۔

قائدین کی آمد کے بعد جیل میں بہت زیادہ رونق اور چہل پہل ہوگئی تھی، اکثر علماء والد محترم سے ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے، والد صاحب قبلہ جیل سے ملنے والے راشن سے مٹھائی وغیرہ تیار کر کے گیارھویں شریف کے ختم کا اہتمام کرتے تھے، ایک روز مولانا غلام محمد ترنم (جنہیں دیوانی گھر سے کچھ فاصلے پر واقع ''بم کیس'' کی بارکوں میں رکھا گیا تھا) معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل کا ہاتھ پکڑ کر انہیں والد صاحب

کے پاس لے آئے اور انہوں نے ازراہِ مذاق فرمایا کہ آج اس وہابی کو گیارھویں شریف کا تبرک کھلانا ہے، مولانا اسمٰعیل ہنستے ہوئے گیارھویں شریف کی محفل میں بیٹھ گئے، ان کے علاوہ عطاء اللہ شاہ بخاری اور کئی دیگر دیوبندی اور وہابی علماء بھی اس محفل میں شریک تھے سوائے مولانا محمد علی جالندھری (ملتان) کے جو بدعت بدعت کی گردان کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے جاتے تھے، اور تبرک لینے سے بھی انکار کرتے تھے، مولانا اسماعیل صاحب نے فاتحہ خوانی میں شرکت کرنے کے بعد کہا کہ اگر یہی گیارھویں شریف ہے تو آپ میرے گھر روزانہ آیئے اور گیارھویں شریف کی فاتحہ کیجئے، پھر انہوں نے تبرک بھی کھایا اور اس کے بعد وہ اکثر والد صاحب سے علمی گفتگو کرتے رہتے تھے، ایک روز گیارھویں شریف کی محفل میں مودودی صاحب بھی شریک ہوئے اور انہوں نے تبرک بھی کھایا، اس دوران ان کی والد صاحب سے چند علمی موضوعات پر گفتگو بھی ہوئی، شام کو میں مودودی صاحب سے ان کی بارک میں ملا تو وہ مجھے کہنے لگے، مولانا ابوالحسنات سے ملاقات کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے اور ان کے تبحر علمی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے، میرا ارادہ ہے کہ میں اپنا لٹریچر ان کے سپرد کر دوں تا کہ وہ اس کی اصلاح کر دیں، میں نے مودودی صاحب سے کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔

دوسرے روز میں والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے مودودی صاحب سے گزشتہ روز کی گفتگو کا ذکر کیا، سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اس موقع پر موجود تھے انہوں نے کہا یہ سب منافقت ہے مودودی کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، انہوں نے اس موقع پر مودودی صاحب کیخلاف اور بھی بہت سخت الفاظ استعمال کیے اور پھر جیل میں ان کے ورکروں نے مودودی صاحب کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی، جیل سے باہر مولانا احمد علی لاہوری نے مودودی صاحب کے خلاف اپنی مہم تیز تر کر دی اور روز نامہ ''نوائے پاکستان'' کے ذریعے پروپیگنڈے کا اچھا خاصہ محاذ قائم کر لیا، لیکن میں بدستور کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہا تا کہ مودودی صاحب سے اس کی اصلاح کروائی جا سکے۔

پھر جسٹس منیر (لاہور ہائی کورٹ) انکوائری کمیشن نے تحریک ختم نبوت کے مقدمہ کی باقاعدہ سماعت شروع کر دی، عدالت میں مودودی صاحب کا رویہ انتہائی افسوس ناک اور خلاف توقع تھا، انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ انہیں ڈائریکٹ ایکشن اور تحریک کے دیگر پہلوؤں سے کوئی اتفاق نہیں تھا، اس پر حافظ خادم حسین، مولانا غلام

محمد ترنم اور حضرت والد محترم نے سخت جرح فرمائی، مودودی صاحب تو یہاں تک کہہ گئے کہ انہوں نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط ہی نہیں کئے تھے، لیکن والد صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس وہ دستاویز اب بھی موجود ہے جس میں ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر آپ نے دستخط کئے تھے، یہ بات سن کر مودودی صاحب نے کہا ہاں میں نے چھوٹے سے دستخط کئے تھے، والد صاحب نے فرمایا تو کیا ہمیں آپ کے دستخطوں کا بورڈ لکھوا کر لگانا چاہئے تھا ،مودودی صاحب لاجواب ہوگئے اور والد صاحب نے وہ دستاویز عدالت میں پیش کردی جس پر ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ تحریر تھا، مودودی صاحب کے علاوہ کسی راہنما نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ اس نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط نہیں کئے تھے۔

بہر حال میں پہلے پہل تو مودودی صاحب کے اخلاق سے بہت متاثر تھا لیکن ان کی اس صریح غلط بیانی اور بزدلانہ روش سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی، انکوائری کا سلسلہ جاری رہا لیکن چونکہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت یہ کمیشن بٹھایا گیا تھا اس لئے کوئی واضح نتیجہ سامنے نہ آیا، چنانچہ ممتاز صحافی مرتضےٰ احمد خاں میکش نے اپنی کتاب ''محاسبہ'' میں اس کمشن کی کارکردگی پر تفصیلی تبصرہ کیا اور تمام پہلوؤں کو واضح کیا۔

انکوائری کے دوران ایک روز والد محترم دیوانی گھر میں تشریف فرما تھے، مولانا عبدالحامد بدایونی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، صاحبزادہ فیض الحسن، سید مظفر علی شمسی اور کچھ دیگر حضرات بھی ان کے قریب آکر بیٹھ گئے، ماسٹر تاج الدین انصاری نے والد صاحب سے کہا حضرت موسم بہار ہے اور مجھے موچی دروازے کی یاد ستا رہی ہے، ہمیں کسی طرح جیل سے باہر جانا چاہئے، حضرت والد صاحب نے فرمایا یہاں ہم ایک عظیم مشن کی تکمیل کے لئے آئے ہوئے ہیں اور پھر میں تو کلام پاک کی تفسیر میں بھی مصروف ہوں باہر جاکر ہم لوگ نہ جانے کن مصروفیات میں اُلجھ جائیں، آیئے بارگاہ الٰہی میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے صدقے اس مقدس مقصد کو پورا فرمائے، جس کی خاطر ہم جیل آئے ہیں، سب نے آمین کہی اور پھر والد صاحب نے دعا فرمائی! الٰہی اپنے حبیب کریم کے صدقے اس جیل کے قیدیوں کو آزادی کی نعمت سے متمتع فرما، اس جیل کی دیواروں کو گرادے اور یہاں باغ و بہار بنادے، سب نے اس دعا پر بھی آمین کہی، یہ کچھ ایسی مقبول ساعت تھی کہ آج اس دعا کا ایک ایک لفظ مقبول و منظور ہوکر ہمارے سامنے آرہا ہے، وہی سنٹرل جیل

آج شادمان کالونی میں تبدیل ہوچکی ہے، اس کی اونچی اونچی دیواریں گر چکی ہیں اور جیل کی بارکیں اب باغ وبہار کا نقشہ پیش کررہی ہیں۔

شادمان کالونی کے مشرقی حصے میں وہ بڑ کا درخت اب بھی موجود ہے جس کے نیچے یہ دعا کی گئی تھی اور جس کے نیچے بیٹھ کر والد صاحب تفسیر لکھا کرتے تھے، تقریباً ایک سال بعد ہائی کورٹ نے کراچی میں گرفتار ہونے والے تمام رہنماؤں کو رہا کر دیا، لیکن مولانا نیازی، مولانا مودودی اور مجھے رہا نہیں کیا گیا تھا۔

ایک طویل عرصے تک جیل میں رہنے سے تقریباً سبھی حضرات ذیابیطس کے مریض ہوگئے تھے، ادھر عوام کے دلوں میں تحریک کے جذبات ابھی تک موجود تھے لیکن جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اور بے انتہا تشدد کر کے تحریک کو کچلنے میں کوئی کسر روانہ رکھی گئی تھی، ہمارے علاوہ تحریک کے دیگر بہت سے رضا کار بھی ابھی تک جیلوں میں تھے، جیل سے رہا ہونے والے زعماء نے اپنے مطالبات کے احیاء کے لئے دہلی دروازے کے باہر ایک عظیم الشان جلسہ کیا، اس جلسہ کی صدارت قبلہ والد صاحب نے کی، اور مختلف راہنماؤں نے اس جلسہ سے خطاب کیا اور تحریک کے حامیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا، اس کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد (جون ۱۹۵۵ء) میں ایک روز میں نمازِ عصر کے بعد بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک جیل کے ایک آفیسر نے آ کر کہا کہ آپ کی رہائی کے آرڈر آئے ہیں، میرے لئے یہ بات خلاف توقع تھی اور پہلے میں نے اسے مذاق ہی سمجھا لیکن پھر جیل کے آفیسر نے چلنے کو کہا تو مولانا نیازی اور مولانا مودودی نے مجھے مبارکباد دی، میری رہائی کے تقریباً چھ سات ماہ بعد مولانا نیازی اور مولانا مودودی کو بھی رہا کر دیا گیا۔

جیل سے رہائی کے بعد مودودی صاحب نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں انہوں نے دیگر معززین شہر کے علاوہ مجھے بھی مدعو کیا، میں نے اس موقع پر مودودی صاحب سے کہا اب حالات معمول پر آ چکے ہیں اپنا وعدہ پورا کیجئے اور اپنا سارا لٹریچر مجھے دیجئے تا کہ والد صاحب سے اس کی اصلاح کروادوں، لیکن مولانا مودودی نے ٹالنے کی کوشش کی، میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے جیل میں میرا ارادہ تو بنا تھا لیکن اب جو چیز چھپ چکی ہے اس کو بدلنا بہت مشکل ہے۔

(بشکریہ، ماہنامہ ''فیضان'' فیصل آباد شمارہ اگست ۱۹۷۸ء، شمارہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء)